© rasailojaraid.com

مولانا فراہیؒ کا طریقۂ تفسیر*

سید جلال الدین عمری

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور قیامت تک کے لیے ہے، یہ علوم و معارف کی ایک پوری کائنات اپنے اوراق میں، اپنے صفحات میں بلکہ اپنی ایک ایک سطر اور اپنے ایک ایک لفظ میں لیے ہوئے ہے۔ اس چشمۂ صافی سے جس بندۂ خدا کو توفیق ملی بقدر ظرف سیراب ہوا اور دنیا کو بقدر توفیق سیراب کرتا رہا، لیکن اس کی بے پایاں حکمتوں اور باریکیوں کا کون احاطہ کرسکتا ہے؟ حدیث شریف میں آتا ہے:-

لا یشبع منہ العلماء	اس سے علماء کا کبھی جی نہیں بھرے گا
ولا یخلق عن کثرۃ الرد	(بلکہ ان کی طلب باقی رہے گی) کثرت تلاوت
ولا ینقضی عجائبہ	سے اس پر بوسیدگی نہ طاری ہوگی اور اس کے عجائب ختم نہ ہوں گے۔

اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے ضعیف قرار دیا ہے[۱] لیکن اس میں جو بات کہی گئی ہے وہ بہت قوی اور حقیقت پر مبنی ہے اس لیے کہ اس کے ساتھ تاریخ ہے قرآن مجید کے نزول پر چودہ سو سال گزر گئے لیکن قرآن مجید کے عجائب نہ ختم ہوئے اور نہ ہوں گے۔ آج بھی کوئی طالب علم اگر خلوص اور یکسوئی کے ساتھ اس پر غور کرے تو یقین ہے کہ وہ اس احساس سے کبھی دوچار نہ ہوگا کہ اس بحر بے کراں کو پوری طرح چھان لیا گیا ہے اور اب اس کی شناوری لاحاصل ہے بلکہ نئے نئے حقائق اس پر منکشف ہوں گے اور اس کے

---

* یہ مقالہ مولانا فراہی سمینار منعقدہ ۸ تا ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۱ء (سرائے میر) میں پیش کیا گیا۔

[۱] ترمذی، فضائل القرآن، باب ماجاء فی فضل القرآن۔ لیکن علامہ قرطبیؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث کے ایک راوی حارث کو امام شعبی جھوٹا قرار دیتے ہیں لیکن ان کی یہ رائے صحیح نہیں ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن جلد اول ص۵)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الفاظ میں پوشیدہ معانی کی وسیع دنیا سے وہ روشناس ہوگا۔

علامہ حمید الدین فراہیؒ اس کی ایک نمایاں مثال ہیں۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی ختم ہونے میں چند ماہ باقی رہ گئے تھے (سن ۱۹۳۰ء) کہ وہ اس دارِ فانی سے کوچ کرگئے اس سے پہلے قرآن مجید پر اتنی گوناگوں اور متنوع خدمات انجام پاچکی تھیں کہ اس میدان میں بظاہر کسی نئی تحقیق یا بڑی کامیابی کی توقع مشکل ہی سے کی جاسکتی تھی لیکن مولانا فراہیؒ کے کارناموں کو دیکھ کر بے اختیار کہنا پڑتا ہے "کم ترک الاول للآخر"

علامہ حمید الدین فراہیؒ نے قرآن مجید پر غور وفکر ہی کو اپنا مقصد حیات بنالیا تھا وہ اسی پر سوچتے اور اس کے متعلقات پر غور فرماتے تھے، ان کی ساری علمی تحقیقات اسی کی روشنی میں ہوتی تھیں جب سے ان کی توجہ قرآن مجید کی طرف ہوئی اس کے بعد زندگی بھر وہی ان کا موضوع تخصص بنا رہا کسی دوسرے موضوع سے انھیں دلچسپی نہیں رہی اور کسی اور طرف انھوں نے نظر اٹھاکر نہیں دیکھی۔ یہ یکسوئی اور انہماک کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن مجید کی ترتیب توقیفی ہے وہ تیئس سال کے دوران وقتاً فوقتاً، تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی الٰہی سے اسے اسی ترتیب کے ساتھ جمع کرایا جس ترتیب سے وہ لوح محفوظ میں موجود تھا اور موجود ہے۔ اسی ترتیب کے مطابق وہ پڑھا اور پڑھایا گیا، آج بھی پڑھا پڑھایا جارہا ہے۔ اس ترتیب سے امام رازیؒ، ابوبکر نیشاپوری اور ابن عربی جیسے علماء نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے اور بظاہر صحیح نتیجہ اخذ کیا ہے کہ قرآن کی آیات میں گہرا معنوی ربط ہے اور اسے انھوں نے تلاش کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ مولانا فراہیؒ اسی کے قائل ہیں۔ اسے انھوں نے جس طرح ایک فکر اور فلسفہ کی شکل عطا کی ہے، اس سے ان کی انفرادیت نمایاں ہے۔ مولانا کے نزدیک پورا قرآن ایک مربوط کتاب ہے اور اس کی چھوٹی بڑی سورتیں اس کے ابواب وفصول ہیں، ہر سورت کا ماسبق اور مابعد کی سورتوں سے گہرا تعلق ہے وہ ایک دوسرے کی توضیح اور تکمیل کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک ہر سورت کا ایک مرکزی موضوع ہوتا ہے جس سے اس کے تمام مباحث براہ راست یا بالواسطہ متعلق ہوتے ہیں، اس سے جیسا کہ مولانا خود فرماتے ہیں کہ قرآن مجید مختلف موضوعات اور منتشر مباحث کی جگہ ایک مربوط اور ہم آہنگ کتاب معلوم ہوتی ہے۔ (مقدمہ تفسیر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا کا طریقہ تفسیر یہ ہے کہ سورت کے داخلی اشارات، اس کے بیانات اور اس کے مجموعی مطالعہ سے وہ اس بات کا تعین کرتے ہیں کہ اس میں اصلاً کس گروہ یا کن گروہوں سے خطاب کیا گیا ہے کن اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، کس ذہن وفکر کی اصلاح کی گئی ہے اور کن پہلوؤں سے اہلِ ایمان کی ہدایت کا سامان کیا گیا ہے، ان سب امور کی روشنی میں مولانا جس طرح آیات کی تشریح کرتے ہیں متقدمین میں اس کی جھلک تو ضرور ملتی ہے لیکن پورے قرآن کو اس انداز میں سمجھنے سمجھانے کی کوشش کو فہم قرآن کی ایک نئی راہ کہنا غلط نہ ہوگا، اس کا دروازہ نہ کبھی بند تھا اور نہ کبھی بند ہوگا۔

تفسیر کا ایک عام اصول یہ ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر قرآن ہی سے کی جائے اس لیے کہ: "القرآن یفسر بعضہ بعضا" دوسرے ذرائع اس کے بعد آتے ہیں۔ امام ابن تیمیہؒ جو سلف کے بہت بڑے نمائندہ ہیں اور جن کی کتاب وسنت پر بڑی گہری نظر ہے فرماتے ہیں:

فان قال قائل فما احسن
طرق التفسیر فالجواب ان
اصح الطرق فی ذلک ان یفسر
القرآن بالقرآن فما اجمل فی
مکان فانہ قد فسّر فی موضع
آخر وما اختصر من مکان
فقد بسط فی موضع آخر
فان اعیاک ذلک فعلیک
بالسنۃ فانہا شارحۃ للقرآن
وموضحۃ لہ[1]

اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ تفسیر کا بہترین
طریقہ کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا
صحیح ترین طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر قرآن سے
کی جائے اس لیے کہ ایک جگہ اس میں اجمال ہے
تو دوسری جگہ اس کی تفصیل کر دی گئی ہے اور
جو چیز ایک جگہ اختصار کے ساتھ بیان ہوئی
ہے اسے دوسری جگہ پھیلا دیا گیا ہے۔ "اگر اس
سے تمہاری دشواری حل نہ ہو تو سنت کو مضبوطی
سے پکڑو اس لیے کہ وہ قرآن کی شارح اور
اس کی اجمالات کو کھولنے والی ہے۔

یہی بات علامہ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر کے مقدمہ اور علامہ سیوطیؒ نے الاتقان میں کہی ہے۔

امام ابن تیمیہؒ کے نزدیک قرآن وسنت کے بعد اقوال صحابہ تفسیر کا تیسرا ماخذ ہیں فرماتے ہیں کہ اگر قرآن وسنت میں ہمیں کسی آیت کی تفسیر نہ ملے تو ہم اقوال صحابہ کی طرف رجوع کریں گے

[1] فتاوی ابن تیمیہ جلد ۱۳ ص ۳۶۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس لیے کہ اس سے ان کی واقفیت دوسروں سے زیادہ ہے۔ انھوں نے ان مخصوص حالات کو بھی دیکھا ہے جن میں قرآن نازل ہوا، پھر یہ کہ انھیں اور خاص طور پر علماء واکابر صحابہ کو فہم کامل، علم صحیح اور عمل صالح کی دولت حاصل تھی۔[1]

مولانا فراہیؒ نے تفسیر القرآن بالقرآن پر بڑا زور دیا ہے۔ ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ قرآن ہی سے اس کے مشکل مقامات حل ہوں۔ اس میں شک نہیں اس کے ذریعہ انھوں نے بہت سے عقدے کھولے ہیں۔ وہ جس لفظ پر بحث کرنا چاہتے ہیں پہلے ان تمام آیات کا استقصا کرتے ہیں جن میں یہ لفظ آیا ہے اور پھر اس کے استعمالات پر غور کرتے ہیں۔ اس کے بعد اس کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہی طریقہ قرآنی اصطلاحات اور آیات کے سلسلے میں اختیار کیا ہے۔ اسے ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ سورہ احزاب آیت ۳۳ میں 'اہلِ بیت' کا لفظ آیا ہے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے مراد ازواج مطہرات ہیں۔ مولانا فراہیؒ نے اس سلسلے میں مزید کئی اہم باتیں بتائی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید نے اہل بیت کا لفظ صرف عورتوں (بیویوں) ہی کے لیے استعمال کیا ہے۔ یہ لفظ واحد اور جمع دونوں کے لیے (یعنی ایک ہو یا زیادہ) استعمال ہوتا ہے۔ اس کی طرف راجع ہونے والی ضمیر ہمیشہ جمع اور مذکر ہوتی ہے۔ اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس میں عورت کے احترام کا پہلو پایا جاتا ہے۔ اسے انھوں نے قرآن کے استعمالات سے مدلل کیا ہے۔[2]

مولانا سورت کے مرکزی موضوع، آیات کے سیاق وسباق اور نظائر کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور ان ہی کی روشنی میں ان کا مفہوم متعین کرتے ہیں۔ اس سے کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ شاید وہ ہمارے تفسیری ذخیرہ کو دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے یا اسے نظر انداز کر رہے ہیں یہ خیال اس وجہ سے بھی ہوتا ہے کہ مولانا کے ہاں قدیم مفسرین اور ان کے حوالے بہت کم ملتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا کے پیش نظر تفسیر کی تمام اہم اور متداول کتابیں رہی ہیں لیکن وہ کسی رائے کو محض اس وجہ سے قبول نہیں کرتے کہ وہ کسی بڑے مفسر کی رائے ہے بلکہ وہ

---

[1] فتاوی ابن تیمیہ جلد ۱۳ ص ۳۶۴

[2] مفردات القرآن ص ۲۷ مطبوعہ مدرستہ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ ۱۳۵۸ھ
ے ہم ہم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس بنیاد پر چلتے ہیں "ھم رجال ونحن رجال" وہ ان سب کی رایوں کا جائزہ لے کر کسی نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کتب تفسیر میں عام طور پر ایک ایک آیت کے ذیل میں بہت سے اقوال اور بہت سی توجیہات ملتی ہیں۔ مفسرین اپنی تحقیق کی روشنی میں ان میں سے کسی قول کو ترجیح دیتے ہیں، کسی قول کو ضعیف قرار دے کر رد کر دیتے ہیں۔ کسی رائے کو جمہور کی رائے کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، کسی کو شاذ رائے کہتے ہیں۔ مولانا فراہیؒ ان تمام دعووں کو من وعن قبول نہیں کرتے بلکہ انھیں ایک جوہری کی طرح پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور جس قول کو قرآن کے الفاظ اور اس کے سیاق وسباق سے قریب پاتے ہیں اسے اختیار کرتے ہیں۔

چنانچہ زیادہ تر مواقع پر مولانا کی تائید میں متقدمین کے اقوال میں سے کوئی نہ کوئی قول یا کسی نہ کسی مفسر کی رائے صراحتاً مل جاتی ہے اور بعض اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ کسی آیت کے ذیل میں کوئی قول مولانا کے لیے غور وفکر کی بنیاد فراہم کرتا ہے، اسے وہ دوسری ہم معنی آیات پر بھی منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں جب اس میں کامیابی ہو جاتی ہے تو اس سے وہ ایک اصول کلیہ وضع کرتے ہیں اور اس کی روشنی میں اس طرح کی تمام آیات کی توجیہہ کرتے ہیں۔ اس صورت میں وہ اس قول کا غالباً اس لیے ذکر نہیں کرتے کہ وہ کوئی اصول نہیں بیان کرتا، بلکہ اس سے صرف ایک آیت کی توجیہہ ہوتی ہے۔ اب ہم بعض مثالوں سے اسے واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

سورہ فاتحہ کو قرآن مجید کا دیباچہ کہا جا سکتا ہے اس کے بعد سورہ بقرہ قرآن کی سب سے بڑی سورت ہے جس میں مباحث اور موضوعات کا بڑا تنوع ہے۔ قرآن کے بیشتر احکام اس میں آگئے ہیں۔ مولانا فراہیؒ فرماتے ہیں کہ اس سورت میں یہود سے خطاب ہے ان کے فساد اور بگاڑ کو واضح کیا گیا ہے اور ان کی کمزوریوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس کے بعد امتِ مسلمہ کو منصب امامت پر سرفراز کیے جانے کا اعلان ہے۔ اسی ذیل میں بہت سے احکام دئے گئے ہیں۔ سورت کی ابتدا الٓمّٓ کے بعد ذٰلک الکتاب سے ہوئی ہے۔ بظاہر یہ ھٰذا الکتاب کا موقع تھا، سوال یہ ہے کہ ذٰلک کیوں کہا گیا؟ زیادہ تر مفسرین نے ذٰلک کو ھٰذا کے معنی میں لیا ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ الٓمّٓ کی طرف اشارہ ہے الٓمّٓ پہلے گزر چکا ہے اس لیے اس کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ بعض مفسرین نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ بھی کہا ہے کہ اس سے پہلے قرآن مجید کا جو حصہ نازل ہو چکا تھا ذلك سے اس کی طرف اشارہ ہے[۱] ان توجیہات سے پوری طرح اطمینان نہیں ہوتا۔ مولانا فراہیؒ نے پوری سورت کی روشنی میں اس سے جو بحث کی ہے اس سے ذہن کی گرہیں کھلتی ہیں۔ مولانا کے نزدیک چونکہ سورت میں خطاب یہود سے ہے اس لیے ذلك الكتاب سے مراد وہ کتاب ہے جو ان کے ذہنوں میں ہے، جس کا ذکر ان کے صحیفوں میں ہے، جس کے بارے میں وہ شک و تردد نہیں کر سکتے۔ اس وضاحت سے آگے کی آیات کی بھی بہترین توجیہہ ہو جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے وہی لوگ تسلیم کریں گے اور اس سے ہدایت پائیں گے جن کے اندر تقویٰ ہے، جو غیب کی حقیقتوں پر یقین اور اللہ کی نازل کردہ تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ مولانا فراہیؒ کی یہ بات بالکل نئی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس کی بنیاد ہمیں ابن جریر میں ملتی ہے وہ کہتے ہیں "وقد قال بعضهم يعني به التوراة والانجيل" اس کے ساتھ مزید فرماتے ہیں کہ اس تاویل کو مان لیا جائے تو پھر ذلك کی توجیہہ کی ضرورت نہیں رہ جاتی اس لیے کہ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ذلك کے ذریعہ ایسی چیز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو نگاہوں کے سامنے موجود نہیں ہے[۲]

قرطبی کے الفاظ اس سے زیادہ واضح ہیں " قيل ان الله تعالى قد كان وعد اهل الكتاب ان تنزل على محمد صلى الله عليه وسلم كتابا فالاشارة الى ذلك الوعد قال المبرد هذا القرآن ذلك الكتاب الذى تستفتحون به على الذين كفروا[۳]

یہاں 'قیل' کے ذریعہ اس قول کے ضعف کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن مولانا فراہیؒ نے اسے کم زور سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا بلکہ اسے اہمیت دی اور اس سے انھیں اس آیت کی توجیہہ میں بلکہ پوری سورت ہی کے بارے میں ایک نقطۂ نظر قائم کرنے میں غالباً مدد ملی ہے۔

سورہ بقرہ ہی کی آیت ۶۲ ہے:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ

---

[۱] تفسیر طبری جلد اول ص ۲۲۵-۲۲۶

[۲] تفسیر طبری جلد اول ص ۲۲۷-۲۲۸

[۳] تفسیر قرطبی جلد اول ص ۱۵۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

اس آیت میں یہود و نصاریٰ اور صابئین کے ساتھ ایمان لانے والوں کے لیے بھی کامیابی کی یہ شرط قرار دی ہے کہ وہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھیں اور عمل صالح اختیار کریں، یہ سوال ذہن میں بار بار ابھرتا تھا اور بہت ممکن ہے اور حضرات کے ذہن میں بھی یہ سوال پیدا ہوا ہو کہ آخر ایمان والوں سے ایمان اور عمل صالح کے مطالبہ کا کیا مطلب ہے؟ ان میں وہ کمزوریاں کہاں سے آگئیں جو دوسرے گمراہ فرقوں میں تھیں۔ ابن جریر فرماتے ہیں معنی ایمان المومن فی ھذا الموضع ثباته علی ایمانه وترکه تبدیله واما الیهود والنصاری والصابئین فالتصدیق بمحمد صلی اللہ علیه وسلم وبما جاء به[1] زیادہ تر مفسرین نے یہی بات کہی ہے لیکن مولانا فراہیؒ قرآن کے استعمالات کی روشنی میں بتاتے ہیں کہ قرآن 'الذین اٰمنوا' اور المومنون میں فرق کرتا ہے وہ جب الذین اٰمنوا کہتا ہے تو اس سے ایمان کا دعویٰ کرنے والا گروہ مراد ہوتا ہے اس میں کمزور ایمان اور قوی ایمان والے دونوں ہی شامل ہوتے ہیں۔ اس وضاحت کے ساتھ مفسرین کے ہاں یہ بات نہیں ملتی۔ لیکن علامہ ابن جریر طبری کہتے ہیں: قال سفیان: المراد المنافقون کانه قال: الذین اٰمنوا فی ظاھر امرھم فلذالک قرنھم بالیھود والنصاریٰ والصابئین، ثم بین من اٰمن باللہ والیوم الاخر من جمیعھم[2]

اس سے معلوم ہوا کہ الذین آمنوا سے ہمیشہ مخلص اہل ایمان ہی مراد نہیں ہوتے۔ یہ بات حضرت سفیان ثوری نے آیت زیر بحث کے سلسلہ میں کہی ہے لیکن مولانا فراہیؒ نے اسے قرآنی استعمالات کی روشنی میں ایک کلیہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ہمیں ان کی قرآنی بصیرت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

سورۂ بقرہ کی آیت ۲۰۸ ہے:

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری جلد ۲ ص۱۴۸

[2] تفسیر ابن جریر طبری جلد ۲ ص۱۴۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	اے ایمان والو! اسلام میں پورے
ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً	کے پورے داخل ہو جاؤ۔

اس میں طبری، سیوطی اور بعض دوسرے مفسرین نے 'کافۃ' کو سلم کا حال مانا ہے۔ اس کی رو سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ اور اس کی تمام احکام کی پابندی کرو۔ اس لیے کہ بعض احکام کی پابندی اور بعض کی خلاف ورزی اسلام کی روح کے خلاف ہے۔ چنانچہ جلال الدین سیوطی کہتے ہیں:

كافة حال من السلم	'کافۃ' کا لفظ 'سلم' سے حال ہے۔ مطلب
اى فى جميع شرائعه [1]	یہ کہ (اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ)
	اس کے تمام احکام شریعت کو قبول کرو۔

کافۃ کے معنی جماعت کے ہیں۔ اس کا مادہ کف ہے۔ جس کے معنی روکنے کے ہیں۔ جماعت کو کافۃ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ افراد کو گھیرے رہتی ہے۔ الگ ہونے نہیں دیتی۔

مولانا فراہیؒ کے نزدیک کافۃ ادخلوا کی ضمیر فاعل سے حال ہے۔ اس لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم سب کے سب اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ زمخشری نے پہلے اسی کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

كافة لا يخرج احد منكم	سب کے سب۔ تم میں سے کوئی بھی
يده عن طاعته	اس کے دائرۂ اطاعت سے باہر قدم نہ رکھے۔

اس کے بعد کہتے ہیں کہ دوسرا مفہوم بھی صحیح ہے۔

ويجوز ان يكون كافة حال	اس کی بھی گنجائش ہے کہ 'کافۃ'
من السلم .... على ان المومنين	کا لفظ 'سلم' سے حال ہو۔ مطلب یہ کہ مومنوں
امروا بان يدخلوا فى الطاعات	کو اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ اسلام (میں
كلها وان لا يدخلوا فى طاعة	پوری طرح آجائیں) اس کے تمام احکام کی
دون طاعة او فى شعب	اطاعت کریں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ایک حکم کو
الاسلام وشرائعه كلها	مانیں دوسرے کو نہ مانیں۔ یا یوں کہنا چاہیے

---

[1] جلالین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وان لا یخلو لبشئ منہا[1] — اسلام اور اس کے تمام قوانین پوری درح اختیار کریں۔ ان میں سے کسی کو بھی نہ چھوڑیں۔

گویا مولانا فراہیؒ نے عام مفسرین کے اختیار کردہ مفہوم کے مقابلہ میں اس مفہوم کو اختیار کیا ہے جسے زمخشری نے ترجیح دی ہے۔

سورہ بقرہ کی آیت "لا اکراہ فی الدین" (۲۵۶) کا یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ دین کے قبول کرنے پر کسی کو مجبور نہیں کیا جائے گا اس کے قبول کرنے یا نہ کرنے کی ہر ایک کو آزادی حاصل رہے گی۔ مولانا فراہیؒ کے نزدیک اس میں جبر فطری کی نفی ہے یعنی اللہ نے کسی انسان کو دین قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا ہے بلکہ اسے آزاد پیدا کیا ہے کہ وہ چاہے تو دین کو اختیار کرے اور چاہے تو نہ کرے۔ مولانا کی یہ تفسیر بظاہر نئی ہے لیکن بعض قدیم مفسرین نے اسے اختیار کیا ہے چنانچہ زمخشری کہتے ہیں لا اکراہ فی الدین ای لم یجر اللہ امر الایمان علی الاجبار والقسر ولکن علی التمکین والاختیار ونحوہ قولہ تعالی ولو شاء ربک لآمن من فی الارض کلہم جمیعا افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین ای لو شاء لقسرہم علی الایمان ولکنہ لم یفعل وبنی الامر علی الاختیار۔ یہی نہیں بلکہ اس آیت کی عام طور سے جو تفسیر کی جاتی ہے اسے زمخشری نے کم زور قول کی حیثیت سے پیش کیا ہے وقیل ھو اخبار فی معنی النہی ای لا تکرھوا فی الدین ثم قال بعضہم ھو منسوخ لقولہ جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیہم[2]

یہ سورۂ بقرہ کی بعض آیات تھیں۔ اب ہم سورۂ بنی اسرائیل کی دو آیات کا حوالہ دیں گے۔ اس ذیل کی پہلی آیت ہے۔

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ۝ (۱۶)

جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اس کے خوش حال لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ اس میں نافرمانی کرنے لگتے ہیں۔ اس کے بعد عذاب کا فیصلہ اس پر چسپاں ہو جاتا ہے اور ہم اسے برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔

---

[1] الکشاف عن حقائق التنزیل: ۱/۳۵۲

[2] الکشاف عن حقائق التنزیل: ۱/۳۸۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس آیت کے تین مفہوم بیان کیے گئے ہیں۔ایک یہ کہ جب کسی بستی کی ہلاکت کا وقت قریب آن لگتا ہے تو ہم اس کے آسودہ حال لوگوں کو فسق وفجور کا حکم دیتے ہیں اور وہ اس کا ارتکاب کرنے لگتے ہیں۔چنانچہ زمخشری کہتے ہیں۔

امرناھم بالفسق ہم نے انھیں فسق کا حکم دیا اور انھوں نے

ففعلوا اس پر عمل کیا۔

یہاں حکم دینے کا مطلب ہے آسودگی اور خوش حالی کا فراہم کرنا۔یہ چیز خیر و فلاح کا ذریعہ بھی ہوسکتی ہے۔لیکن جب کوئی قوم خوش حالی میں خدا کو بھول جاتی اور فسق وفجور کی راہ اختیار کرلیتی ہے تو تباہ کردی جاتی ہے۔زمخشری کو اصرار ہے کہ آیت کے الفاظ اسی مفہوم کی تائید کرتے ہیں[1]

اس کا دوسرا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ 'امرنا' یہاں کثّرنا کے معنی میں ہے یعنی جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے مترفین اور خوش حال افراد میں اضافہ کردیتے ہیں۔

اس کا تیسرا مطلب وہ ہے جو مولانا فراہی بیان کرتے ہیں۔وہ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے پہلے اللہ تعالیٰ کا یہ قانون بیان ہوا ہے۔

وماکنا معذبین حتیٰ ہم کسی قوم پر عذاب نہیں نازل کرتے جب

نبعث رسولا تک اس میں رسول نہ بھیج دیں۔

اس قانون کے بیان کرنے کے بعد کہا گیا کہ جب کسی قوم کے آسودہ حال افراد و خواہشات کے پیچھے چلنے لگتے ہیں اور عیش و عشرت اور فسق و فجور میں ڈوب کر ہلاکت کے مستحق ہوجاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انھیں ہلاک کرنے سے پہلے اپنے رسول بھیجتا ہے جو انھیں اس کے احکام و مرضیات سے آگاہ کرتا ہے۔اسی میں اس کا امتحان ہوتا ہے۔اس کے باوجود اگر وہ نافرمانی اور معصیت ہی کی راہ اختیار کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ کا قانون اپنا کام کرنے لگتا ہے اور وہ تباہ کردی جاتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ انذار کے بغیر کسی قوم پر عذاب نہیں آتا۔یہ وہ حقیقت ہے جو قرآن کی مختلف آیات میں بیان ہوئی ہے۔

یہی تفسیر عام طور پر مفسرین نے کی ہے۔جلالین کی مختصر عبارت یہاں نقل کی جارہی ہے۔

---

1. الکشاف عن حقائق التنزیل : ۲/۴۴۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(امرنا مترفیھا) منعیھا — ہم نے ان کے مترفین کو یعنی ان کے
یعنی رؤسائھا بالطاعۃ — اصحاب دولت اور رؤسا، کو اپنے رسولوں کی
علی لسان رسلنا(ففسقوا — زبان سے اطاعت کا حکم دیا لیکن انھوں نے
فیھا) فخرجوا عن امرنا — اس میں (بستی میں) فسق کی راہ اختیار کی یعنی ہمارے
...... [1] — احکام سے خروج کیا۔

بعض تفسیری روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے[2]

سورہ بنی اسرائیل کی ایک اور آیت ہے ویسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔ یہاں عام طور پر مفسرین نے روح سے روحِ حیوانی مراد لی ہے مولانا فراہیؒ کہتے ہیں کہ یہ سوال وحی سے متعلق تھا مولانا کے خیال کی تائید ایک تو اوپر کے مضمون سے ہوتی ہے دوسرے یہ کہ سلف میں اس رائے کے قائلین موجود ہیں علامہ آلوسی نے سوال کو روح حیوانی ہی سے متعلق مانا ہے۔ اس پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے لیکن ساتھ ہی فرماتے ہیں قال الحسن وقتادۃ الروح ھو جبرائیل وقد سمی روحا فی قولہ تعالٰی (نزل بہ الروح الامین علی قلبک) والسوال عن کیفیۃ نزولہ والقائہ الوحی الیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام وقال بعضھم ھو القرآن وقد سمی روحا فی قولہ تعالٰی: (وکذلک اوحینا الیک روحا من امرنا)[3] آگے چل کر یہ بھی بتایا ہے کہ یہ مفہوم سیاقِ کلام سے قریب بھی ہے۔

مولانا فراہی کی عربی لغت پر اس کے ماہرین کی طرح نظر تھی، قدیم عربی ادب کا انھوں نے بڑی دقت نظر سے مطالعہ کیا تھا صحف سماوی سے ان کی براہ راست واقفیت تھی۔ ان سب سے مولانا نے تفسیر قرآن کے سلسلہ میں مدد لی ہے۔ یہاں صرف تفاسیر سے ان کے استفادہ کے طریقے کی وضاحت کی کوشش کی گئی ہے۔

---

[1] جلالین

[2] تفصیل کے لیے دیکھئے۔ روح المعانی ۴۳/۱۵

[3] روح المعانی جزء ۱۵ صہ ۱۵۲

© rasailojaraid.com